رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ۹۲۲۲

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے — سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۲	۱۵ مارچ ۱۹۵۴ء	ایڈیٹر قاضی عبدالغفار	۱۰ رجب ۱۳۷۳ھ	نمبر ۳۰

اردو اور فرقہ پرستی

آج کل اترپردیش کی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ اس اسمبلی میں اردو کا اور اس کے ساتھ اقلیت کی فرقہ پرستی کا نام نہ آتا۔ اتنا ذہنی توازن باقی نہیں ہے کہ ہمارے لیڈر یہ سوچتے کہ اب جبکہ یہ مقدمہ صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش ہو چکا تو چند روز خاموش رہ کر صدر اور حکومت ہند کے فیصلے کا انتظار کیا جائے! لیڈروں کو جب تقریر کرنی ہوتی ہے یا جب ایڈیٹر کو مضمون لکھنا ہوتا ہے تو وہ اس قسم کی اخلاقیات پر کب نظر کرتا ہے چنانچہ اسمبلی میں یہ پھلجھڑیاں چھوٹیں اور یہ وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے کہ جب اردو کا ذکر آیا تو اس کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اقلیت کی فرقہ پرستی کا بھی ذکر آ گیا۔ اردو کے مخالفین کے بعض حلقوں میں اب تو یہ بات عام ہو گئی ہے کہ اگر بازار یا محلے میں کسی کا پاؤں بھی پھسل جائے تو وہ بھی پاکستانی ذہنیت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اسمبلی میں چند روز یہ ذکر نہ آتا تو بہتر تھا۔ لیکن جب بات چھڑی تو مولانا فاخر صاحب نے بہت کھری کھری باتیں کہہ دیں اور وہ سنتے تو کیا ہے؟ موصوف نے فرقہ پرستی کے طعنوں اور ہندوستان سے نکال دیئے جانے کی دھمکیوں کا وہی جواب دیا جو کسی باعزت شہری کو دینا چاہیئے۔ موصوف نے اردو کے متعلق بہت صاف اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ جب تک اس ملک میں اردو والے زندہ ہیں اردو بھی زندہ رکھی جائے گی۔ معترضین پر تو اثر کیا ہوا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں، اور ان کا ضمیر بیدار ہو تو انہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اردو زبان کی تحریک میں کبھی فرقہ پرستی کا شائبہ بھی نہیں آیا اور انجمن ترقی اردو کا یہ ایک کارنامہ ہے کہ اس نے ان کانٹوں سے بچ کر ایک خالص دستوری تحریک کو دستوری طریقوں سے چلایا اور اس کی منزل تک پہنچا دیا۔ اگر اردو کے حامیوں میں وہ فرقہ وارانہ عصبیت ہوتی جس کا مظاہرہ اکثریت کے بعض فرقہ پرستوں نے گزشتہ جولائی میں لکھنؤ کی اردو کانفرنس کے دروازے پر کیا تھا تو ایک بے گناہ رضاکار پر قاتلانہ حملے کے بعد وہ کئی ہزار اشخاص جو کانفرنس میں بیٹھے ہوئے تھے خدا جانے کس درجہ مشتعل ہو جاتے اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ لیکن کانفرنس کے شرکا میں سے ایک شخص بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ اور اس اجتماع نے صبر و سکون کا ایک شاندار ثبوت دیا لیکن ؎

"پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں"

اسمبلی میں جو بے محل راگ چھیڑا گیا تو اس کے جواب میں آخر مولانا فاخر صاحب کو اپنی نثر میں اس مصرع پر گرہ لگانی ہی پڑی! لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا اردو کے معاملے میں بے صبر نکتہ چینوں کو اس وقت تک تو خاموش رہنا چاہیئے جب تک کہ صدر جمہوریہ اور حکومت ہند انجمن کے معروضے کا کوئی فیصلہ نہ کر دیں۔ افسوس اس کا ہے کہ ہمارے قانون ساز لیڈر ابھی کچھ فرمانے کے جوش میں قانون ساز جماعتوں کی شائستگی کے اصولوں کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے۔

یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ خود اترپردیش کے وزرا کا حال یک بام و دو ہوا ہے۔ ایک کچھ کہتا ہے اور دوسرا کچھ کہتا ہے۔ سمپورنانند جی اردو کو کوئی زبان ہی نہیں مانتے اور چیف منسٹر صاحب فرماتے ہیں کہ وہ بھی اس ملک کی ایک زبان ہے۔ جہاں خیالات کا یہ انتشار ہو وہاں سنجیدہ گفتگو کا کوئی موقع مل ہی نہیں سکتا۔

بہرحال انجمن تو اپنا فرض (معروضہ پیش کرنے کی حد تک) ادا کر چکی اور اردو زبان کے حامیوں نے ۲۰ لاکھ دستخط جمع کر کے اپنی زبان کے ساتھ اپنی مخلصانہ محبت کا ثبوت دے دیا۔ اب اگر اس سلسلے میں اشتعال انگیز تقریریں کی جائیں اور طعنے دیئے جائیں اور بہتان باندھے جائیں تو اس کا جواب ہماری باوقار خاموشی ہی ہو سکتی ہے۔

اردو کہاں

حیدرآباد میں اب تک یہ طے نہ ہو سکا کہ اردو کا مقام کیا ہے۔ وہاں عنقریب ایک اردو کانفرنس ہونے والی ہے۔ اس کا بڑا کام یہی ہونا چاہیے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کس طرح حیدرآباد میں اردو کی علاقائی حیثیت کا استقرار کرایا جائے۔ حال ہی میں سرکاری طور پر حیدرآباد کے تین علاقوں میں علاقائی زبان کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا، لیکن اس اعلان میں اردو زبان کا جس کی حیثیت بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے حیدرآباد کی علاقائی زبانوں میں تیسری ہے کہیں ذکر نہیں۔ حیدرآباد کی بزم اردو کی طرف سے وہاں کے اخبارات میں ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

"ہمیں مقامی اخبارات میں یہ دیکھ کر تعجب ہی نہیں بلکہ مایوسی ہوئی کہ ضلع واری زبانوں کی تقسیم میں اردو کا کہیں نام نظر نہیں آتا حالانکہ حیدرآباد میں اردو ایک سرکاری زبان کی حیثیت سے رہ چکی ہے اور آج بھی بلا لحاظ مذہب و ملت اردو ہی سب سے زیادہ بولی جاتی ہے اور اسے سب اپنی زبان سمجھتے ہیں اور کچھ صرف مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ دکھنی ہندوؤں نے بھی اپنی زبان سمجھ کر اس کی ترقی و ترویج کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں جس طرح انگریزی کی اہمیت تھی اس سے کہیں زیادہ اردو کی اہمیت یہاں پر تھی اور اب بھی ہے۔ آج حیدرآباد میں بسنے والا کون سا ایسا فرد ہے جو اردو نہیں جانتا نہیں سمجھتا اور نہیں بولتا ہے۔ اگر اس طرح حیدرآباد کی سرزمین سے اردو کو مٹایا گیا اور اس کی جگہ دوسری زبانوں کو عوام پر جابرانہ طور سے مسلط کیا گیا تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ بیروزگاروں کی فوج میں اضافہ کرنا اور معاشی بحران پیدا کرنا حکومت کا منشا اور مقصد ہے۔ کیونکہ اس سے ہر طبقہ متاثر ہوگا۔ انقلاب کے بعد ہزاروں ملازمین کو محض اس عذر پر علیحدہ کر دیا گیا کہ وہ مقامی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی سے بھی ناواقف ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علاقائی اور دیسی حکومتوں میں انگریزی کی اہمیت کس قدر ہے۔ یہ ہمارے لئے باعث شرم ہے۔ باہر سے آنے والے لوگ کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے ساتھ ساتھ تلگو وغیرہ بھی بول لیتے ہیں جن کی بنا پر انہیں فوراً اداروں ملازمت میں شریک کر لیا جاتا ہے مگر ایک وہ شخص جو یہیں پیدا ہوتا ہے اس ماحول میں پروان چڑھتا ہے اور اپنے وطن سے محبت کرتا ہے۔ قابلیت اور صلاحیت بھی رکھتا ہے محض اس جرم پر کہ وہ علاقہ واری زبان نہیں جانتا ملازمت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی تن پروری کے لئے محنت اور مزدوری سے کام لینا پڑتا ہے۔ اردو کو دستور میں جو مقام دیا گیا ہے کم از کم اس کا احترام ہم پر لازم ہے۔ جہاں دوسری زبانوں کو اپنایا جا رہا ہے وہیں اردو کو بھی اس کے ساتھ ساتھ جگہ دی جائے تو یہ انتہائی مستحسن اقدام ہوگا۔ اس لئے ہم حکومت سے پرخلوص استدعا کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے ملک میں بسنے والے ہزاروں افراد کی معیشت خطرے میں پڑ جائے اور ان کی دل شکنی ہو۔ اس کے علاوہ ہم تمام اہل قلم اور اردو نواز حضرات سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ اردو کی اہمیت کے پیش نظر اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت و ترویج کی طرف توجہ کرتے ہوئے اسے علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ مقام دلانے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دیں۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ اب وقت آگیا ہے کہ حیدرآباد میں اب عرض داشتوں کی حد سے گزر کر اردو کے مسئلے کا ایک عوامی محاذ قائم کیا جائے۔ آئندہ اپریل میں جو اردو کانفرنس ہو رہی ہے اس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ اس کانفرنس میں حیدرآباد کے تمام ادبی اور علمی ادارے [illegible] اردو کی تحریک میں اس لئے اسی کانفرنس کے پلیٹ فارم پر اب یہ سوال طے ہونا چاہیے کہ حیدرآباد میں اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کے لئے ان اداروں کو ایک منظم تحریک شروع کرنی چاہیے۔ حکومت کے مسلک کا صحیح اندازہ ہو جانے کے بعد اب اس کام میں تاخیر اردو زبان کے مفادات کے لئے خطرناک ہوگی۔

شاخوں کی کانفرنس

ہمارے پاس مختلف سمتوں سے تقاضے آ رہے ہیں کہ اب تو انجمن کا وفد صدر جمہوریہ کی خدمت میں حاضر ہو چکا۔ اب کانفرنس کا انعقاد ہونا چاہیے۔ کانفرنس کا خیال جس وقت پیدا ہوا تھا تو یہ امید تھی کہ وفد کی حاضری کے بعد ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس معاملے میں مرکزی حکومت کا نقطۂ نظر کیا ہے اور ہمارے مطالبات کے کامیاب ہونے کی کہاں تک امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن چونکہ صدر جمہوریہ نے حکومت سے مشورہ کر کے جواب دینے کا وعدہ فرمایا ہے اس لئے فی الوقت اس مسئلے کے متعلق کانفرنس کے سامنے پیش کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اب رہا اردو کی ترویج کے لئے آئندہ تنظیم کا مسئلہ، اس کا انحصار بھی بہت حد تک اس جواب پر ہے۔ یعنی یہ طے کرنا کہ اگر مطالبات کامیاب نہیں ہوتے تو ہماری جدوجہد کا رخ کیا ہوگا اور اگر کامیاب ہو گئے تو ہم کس طرح اپنے کام کی تنظیم کریں گے اس وقت بہت مشکل ہے۔

یہ ممکن نہیں کہ ایک کانفرنس اب کی جائے اور ایک چند روز بعد جب حکومت کا جواب مل جائے۔ موجودہ حالات میں یکے بعد دیگرے دو دو کانفرنسوں میں شرکت کرنا ہمارے کارکنوں کے لئے بھی مشکل ہوگا۔ اس لئے یہی طے کیا گیا کہ چند روز اور انتظار کر لیا جائے اور اگر ہو سکے تو اپریل یا مئی میں یہ کانفرنس طلب کی جائے۔ اردو کے حامیوں اور دوستوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آئندہ ہمارے کام کی تنظیم کا مسئلہ کسی وقت بھی انجمن کی نظر سے دور نہیں ہو سکتا۔ تاخیر کا مقصد اگر ضروری اور مفید ہو تو اسے گوارا کرنا چاہیے۔

رسم الخط

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں زبان کا مسئلہ بھی سیاسی اور مذہبی فرقہ بندی کے رنگ میں رنگا جا چکا ہے۔ اس لئے کوئی سیدھی بات سیدھی طرح کہی نہیں جاتی۔ جذبات کی آندھیاں چل رہی ہیں اور ان آندھیوں میں عقل سلیم کا شیرازہ بکھرا جا رہا ہے۔ رسم الخط اور زبان کا مسئلہ قومی تعمیر کا ایک بنیادی مسئلہ ہے لیکن وہ بھی فرقہ پرستی کے دیوتا کے استھان پر قربانی کا بکرا بنا ہوا ہے۔

زبان کی بحث سے میرے اس مضمون کا براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ عقیدہ میرا یہ ہے (کوئی مانے یا نہ مانے) کہ قومی زبانیں نہ تو کسی حکومت کے حکم سے ترقی کرتی ہیں اور نہ صرف لیڈروں کے اشاروں پر ان کا ارتقا منحصر ہوتا ہے۔ قوموں اور زبانوں کی تاریخ میرے اس عقیدے پر سند ہے۔ میری بحث کا دارومدار صرف اس کلیہ پر ہے کہ ہر زبان کی ترقی اور استحکام کے لئے قبول عام ضروری ہے اور قبول عام کے یہ معنی ہیں کہ زبان ایسے الفاظ کا ذخیرہ ہو جنہیں عوام آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں اور بول سکیں۔ رسم الخط کے سوال کو بھی میں اسی اصول اور اسی کسوٹی پر جانچنا چاہتا ہوں۔ ملک کی قومی زبان کا نام ہندی ہو یا ہندوستانی (میں ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق تسلیم نہیں کرتا) مگر یہ ضروری ہے کہ وہ عام فہم ہو اور جس طرح زبان کا عام فہم ہونا ضروری ہے اسی طرح رسم الخط کا بھی ایسا ہونا ضروری ہے جو زیادہ سے زیادہ پھیل سکے اور جسے زیادہ سے زیادہ تعداد آسانی کے ساتھ اختیار کر سکے۔ یہ ایک تمسخر انگیز حقیقت ہے کہ ہمارے بعض لیڈروں میں جن کی آواز اس معاملے میں بہت بلند ہے اکثر ایسے ہیں کہ وہ جو زبان تجویز کرتے ہیں اسے خود بھی نہ بول سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔

رسم الخط کے معاملے میں بھی وہ سائنٹفک اور افادی نقطۂ نظر اختیار کرنے کے بجائے جذباتی نقطۂ نظر سے وابستہ ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے یا کرتے ہیں تو سمجھتے نہیں کہ کسی زبان کے "قومی" اور عام ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک ہی رسم الخط میں ہر جگہ لکھی جائے اور پڑھی جائے۔

یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اردو رسم الخط پڑھنے لکھنے کے لئے جتنا آسان سمجھا جاتا ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ دیوناگری کے مقابلے میں اس کے مفرد حروف بلاشبہ زیادہ آسان ہیں۔ ان میں خطوط اور دائروں کے سوا کوئی ایسے پیچیدہ شوشے، ماترائیں، اور ٹکڑے نہیں جن کا لکھنا اور پہچاننا بچوں کے لئے دشوار ہو۔ مثلاً حسب ذیل حروف کو دیکھئے۔

الف	ب	ت	ٹ	ث	ج	چ	خ
अ	ब	त	ट	स	ज	छ	ख

صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں زیادہ آسان ساخت اردو مفردات کی ہے علاوہ بریں اردو حروف کے نشانات صرف ۱۰ ہیں اور صرف تین اعراب ہیں۔ لیکن دیوناگری میں ۴۸ حروف ہیں اور کم از کم ۱۰ ماترائیں۔ ان کے علاوہ بھی اردو رسم الخط کی فوقیت کے بعض دوسرے پہلو ہیں جو اس مضمون میں خارج از بحث ہیں۔ لیکن مفردات کی آسانی کے باوجود اردو رسم الخط مرکبات کی صورت میں اتنا ہی تقریباً مشکل ہو جاتا ہے جتنا کہ دیوناگری جس کے مفردات بھی مرکبات ہیں۔ اردو کے حروف جب مرکبات کی صورت اختیار کرتے ہیں تو وہ دیوناگری سے کچھ کم مشکل نہیں بن جاتے۔ درحقیقت اردو رسم الخط ایک قسم کی مختصر نویسی ہے۔ لیکن کوئی شارٹ ہینڈ کسی قومی زبان کا رسم الخط تو نہیں بنایا جا سکتا اس لئے کہ رسم الخط کے افادی پہلو پر نظر رکھنی ضروری ہے اور یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ٹائپ اور طباعت کی سائنٹفک ترقیوں کے ساتھ کون سا رسم الخط زیادہ چل سکتا ہے۔ میں نے اور میری طرح بہت سے دوسرے لوگوں نے جب ان تمام پہلوؤں پر غور کیا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ درحقیقت ایک ہی صحیح معیار ہے جس کے مطابق ہمیں اپنے ملک کے لئے رسم الخط کا انتخاب کرنا چاہئے اور وہ ہے افادیت کا معیار ہے۔ ایک حد تک میں دیوناگری رسم الخط کو اردو رسم الخط سے زیادہ سائنٹفک سمجھتا ہوں اس لئے کہ ٹائپ اور طباعت کی ترقیوں کا ساتھ اس رسم الخط نے زیادہ دیا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اردو رسم الخط کا کوئی اچھا ٹائپ اگر بن بھی جائے تو وہ [illegible] کی نزاکتوں کی وجہ سے پائیدار نہیں ہوتا اور اس لئے تجارتی حیثیت سے بہت مہنگا پڑتا ہے۔ لیکن ایک حد تک دیوناگری کی ماتراؤں اور شوشوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اس بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر اردو رسم الخط کو نظر انداز کر کے ہم دیوناگری رسم الخط ہی کو اختیار کر لیں تو وہ بھی اردو کی طرح چند خاص صوبوں کا مقامی رسم الخط ہے اور بعض صوبے تو ایسے ہیں جو اسے اختیار کرنے پر آمادہ ہی نہیں۔۔۔ ہندوستان کے چند بڑے صوبے ایسے ہیں جہاں اس رسم الخط کو رائج کرنے کی جو کوششیں کرنی پڑیں گی، اور ایک ناراض آبادی کو رضامند کرنا پڑے گا۔ اور اگر [illegible] کی کوشش اور حکومت کے اثر سے اس رسم الخط کے رائج کرنے میں پوری کامیابی حاصل بھی ہو جائے تب بھی ہر صوبے میں بیک وقت دو رسم الخط رائج ہو جائیں گے اور ہندی یا ہندوستانی زبان بہرحال دو رسم الخط کی پابند ہوگی۔

مہاتماجی نے ہندوستانی کے ساتھ دو رسم الخط اختیار کرنے پر زور دیا تھا اس پر اب یہ اعتراض کیا جا رہا ہے کہ دو رسم الخط اختیار کرنے سے بچوں کی تعلیم کا بوجھ بہت زیادہ ہو جائے گا اور تعلیم میں وقت اور روپیہ بھی زیادہ صرف ہوگا۔ لیکن غور کیجئے تو یہ اعتراض اس صورت میں بھی باقی رہتا ہے جب ہم اکثر صوبوں میں مقامی رسم الخط کے ساتھ دیوناگری رسم الخط بھی سکھائیں۔ یہ بات تو تسلیم ہے کہ مقامی زبانوں اور مقامی رسم الخط کی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے گی۔ تب پھر دیوناگری اکثر صوبوں میں دوسرا لازمی رسم الخط ہوگی۔ یہ دشواری ہندوستان ہی کے لئے مخصوص ہے لہٰذا دو رسم الخط کی ضرورت کو تسلیم کر کے ہی ہم اس بحث میں آگے قدم اٹھا سکتے ہیں۔

چند روز ہوئے زبان اور رسم الخط کے مسئلے پر ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک مضمون اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ :-

> "جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ناگری رسم الخط ہی قانونی رسم الخط ہوگا . . . . میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے لئے رومن رسم الخط کا وسیع پیمانے پر اختیار کرنا ممکن ہوگا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندستان کی فوج میں رومن رسم الخط بہت موثر طریقے پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ تجربے نے بتایا ہے کہ اس کا سیکھنا آسان ہے اور وہ کسی حد تک فوج میں اتحاد پیدا کرنے والا عنصر ثابت ہوا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اُس کے استعمال کے امکانات کی تحقیقات کی جائے اور اس کو جہاں کہیں مناسب اور ممکن ہو استعمال کیا جائے۔"

ان الفاظ کی روشنی میں ہمیں تمام جذباتی بحثوں سے قطع نظر کرکے یہ دیکھنا چاہیئے کہ رومن رسم الخط کو اختیار کرنے میں ہمارے ملک کا فائدہ دیوناگری اختیار کرنے سے کچھ زیادہ ہے یا کم۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ جنوبی ہندوستان اور بعض دوسرے صوبے بھی دیوناگری رسم الخط سے مانوس نہیں ہیں بلکہ ان صوبوں کے اکثر نمائندے جو پارلیمنٹ میں شریک ہیں اس رسم الخط کو اختیار کرنے پر آمادہ معلوم نہیں ہوتے اور نہ وہ اس ہندی زبان کو پسند کرتے ہیں جو سنسکرت کے مادہ سے تیار کی جارہی ہے۔ اگر مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے درمیان جن کی مقامی زبانیں مختلف ہیں کوئی ایک رسم الخط رابطہ بن جائے تو ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ بلحاظ افادیت وہ رسم الخط کونسا ہو سکتا ہے یہ تو ممکن نہیں کہ صوبوں کو اس قدر ایک دوسرے سے بے تعلق کردیا جائے کہ یہاں کا لکھا وہاں اور وہاں کا لکھا یہاں کوئی نہ پڑھ سکے۔ اس لئے کہ میں کہہ چکا ہوں کہ افادیت کے نقطہ نظر سے دیوناگری اور اردو دونوں یکساں ہیں۔ لیکن چونکہ دیوناگری کو سرکاری رسم الخط قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا اور رومن رسم الخط کے درمیان قومی افادیت کا مقابلہ ہونا چاہیئے۔

سب سے پہلے قابل لحاظ امر یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی تعلیم یافتہ آبادی رومن رسم الخط سے واقف ہے۔ ان صوبوں میں بھی جہاں دیوناگری رسم الخط ابھی تک رائج نہیں ہے رومن رسم الخط رائج ہے۔ فوج کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ سوال صرف اتنا ہی ہے کہ آیا ان صوبوں کے لئے کوئی ایسا رسم الخط موزوں ہوگا جس سے تعلیم یافتہ آبادی پوری طرح مانوس ہو چکی ہو یا کوئی ایسا رسم الخط جس سے بہ مشکل آشنا ہے۔ وقت کا سوال اور آسانی کا سوال اس مسئلے میں فیصلہ کن ہونا چاہیئے اور یہ فیصلہ زیادہ سے زیادہ تعداد کے زیادہ سے زیادہ مفاد کی بنا پر طے ہونا چاہیئے۔ بہت بڑی غلطی ہوگی اگر وہ ایک دو صوبے جہاں دیوناگری رائج ہے۔ اس مسئلے کو محض جذبات کے تحت تمام صوبوں پر حاوی کردیں اور عملی افادیت کے نقطہ نظر سے قطع نظر کرلیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ کوئی بھی عام قومی زبان اختیار کی جائے وہ اس کا نام ہندی ہو یا ہندوستانی بہت آسانی کے ساتھ ایک ایسے رسم الخط کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے جس سے تمام ہندوستان کی تعلیم یافتہ آبادی واقف ہے۔ کیا قرین عقل یہ نہ ہوگا کہ ہم اس لحاظ سے آسان ترین اور بنیادی سائنٹفک رسم الخط کو اختیار کریں اور جو بنیادیں قائم ہوچکی ہیں ان پر اپنی قومی زبان کی دیواریں اٹھائیں یا یہ قرین عقل ہوگا کہ ایک ایسے رسم الخط کو سکھلانے میں وقت صرف کریں جس سے ملک کے تمام صوبے یکساں واقف نہیں ہیں۔ اور جو ان کی مقامی زبانوں کے مزاج سے مختلف ہے۔ اگر صحیح طور پر اعداد جمع کئے جائیں تو یہ امر صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقوں میں دیوناگری رسم الخط سے زیادہ رومن رسم الخط کے جاننے والے ملیں گے۔

اس بحث میں جو جذباتی پہلو بہت نمایاں ہے وہ میری نظر میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے اور منطقی نقطہ نظر سے بھی یہ جذباتی پہلو بہت بودا معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح اردو زبان کے بعض کم نظر حامیوں نے فرقہ پرستی کے اسی بربادکن طوفان میں جو ہمارے ملک میں گزرا تھا اردو کا دامن اسلامی تہذیب و تمدن سے باندھ لیا اسی طرح ہندو فرقہ پرستوں نے بھی زبانوں کو ہندو اور مسلمان بنانا شروع کردیا اب زبانیں مخصوص کلچر اور تہذیب و تمدن کے دامنوں سے باندھی گئی ہیں۔ زبانوں کا تعلق کسی مخصوص تمدن اور کلچر سے جبلی اور نسلی تو ہو نہیں سکتا۔ یہ تعلق تو صرف اتنا ہی ہوتا ہے جتنا آئینہ کا تعلق اس شخص کی صورت سے جو اس کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ جو لوگ ہندی یا سنسکرت زبان کے رواج پر صرف اس لئے زور دے رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کے قدیم کلچر کی نمائندہ ہیں وہ شاید زبانوں کے ارتقا کی تاریخ ہی سے واقف نہیں یا وہ کلچر کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہیں۔ ترکی اور فارسی اور عربی زبانوں کا مذہب اسلام سے کوئی بنیادی تعلق نہیں۔ درحقیقت یہ تینوں زبانیں قدیم غیر مسلم کلچر کی نمائندہ ہیں لیکن ان زبانوں کے جاننے والے جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو ان زبانوں کو اپنے ساتھ لے آئے حقیقت تو یہ ہے کہ "کلچر" سے زیادہ فتنہ انگیز کوئی اصطلاح بیسوی صدی عیسوی میں ایجاد نہیں ہوئی۔ یہی اصطلاح ہٹلر کی زبان پر متمدن دنیا کی بربادی کا باعث ہوئی اور یہی اصطلاح آج بدترین قدامت پرستی، رجعت پسندی اور "ریوائولزم" (REVIVALISM) کی تخلیق بن گئی ہے۔ "ریوائولزم" بطور ایک عقیدے کے انحطاط اور زوال کی علامت ہے "پیچھے چلو" اور "قدیم کو جدید پر ترجیح دو" ایسے نعرے ہیں جو ترقی پسند زندگی کی نفی ہیں۔ بلاشبہ ہم اپنے قدیم سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرسکتے اسی بنیاد پر ہمیں نئی عمارتوں کی دیواریں کھڑی کرنی ہیں۔ لیکن ہم سائنس اور فلسفہ کے اس دور میں قدیم کی بھاری زنجیریں اپنے پاؤں میں ڈال کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

چند ہی سال ہوئے کہ ایران اور ترکی نے اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ یہ

نعرے بلند کئے تھے اور ایران کی "پہلویت" اور ترکوں کی "تورانیت" ایک عقیدے کی طرح پیش کی گئی تھی۔ لیکن چند ہی روز میں دونوں قوموں کے مصلحین کو اس قدیم تصور پرستی سے روگرداں ہو کر انسانیت آگے بڑھنے والے زمانہ کی طرف پھرنا پڑا۔ ہندوستان میں بھی گزشتہ انقلاب کے بعد قدامت پسندی کی وہی آندھی چل رہی ہے۔ میں اس کیفیت کو آزادی کی بدہضمی کہتا ہوں جو عناصر زمانے کی رفتار کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں اپنے لئے اقتدارات قدامت پرستی کے پرانے قلعوں میں محفوظ کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ایسا نہ کر سکیں گے۔ مذہبی قدامت کے جن اقتدارات کو علوم اور سائنس کی ترقیوں نے تھکا دیا ہے انہیں از سر نو مذہب اور کلچر کے نام پر قومیت کو زندہ کرنے کی تحریک کچھ روز انتشار تو پیدا کر سکتی ہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکتی۔ البتہ افسوس اس کا ہے کہ اسی تحریک کا شکار اس وقت زبان اور رسم الخط کا مسئلہ ہو رہا ہے حالانکہ وہ قومی تعمیر کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔

بحث کا ایک اور عجیب پہلو اس سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ ہر زبان کا رسم الخط وہی ہو سکتا ہے جو اس کے حروف اور املا کی آوازوں کو صحیح طور پر پیش کر سکے۔ آوازوں اور اصوات کا معاملہ اتنا اہم نہیں جتنا کہ وہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ ایک ہی زبان کے مختلف علاقوں میں الفاظ کی آوازیں مختلف ہوتی ہیں، تلفظ مختلف ہوتا ہے ـــــ بعض اوقات اتنا مختلف ہوتا ہے کہ لفظوں کی صورت بدل جاتی ہے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود زبان ان سب علاقوں کی ایک ہی ہوتی ہے۔ اگر دو مختلف رسم الخط کی وجہ سے ہندی اور اردو کے لفظوں کی آوازوں میں کچھ فرق آ جائے تو یہ کوئی ایسی خرابی نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی زبان کو بین الاقوامی بنانے کی اہم مصلحت کو نظر انداز کر دیں۔ یہ سب سوچنے اور سمجھنے کی باتیں ہیں، مسئلے کی گتھیں پھیلا کر کھینچنے اور چلانے کی باتیں نہیں ہیں۔

"حقیقت شناس"

"حقیقت شناس" کے نقطۂ نظر پر اگر اہل نظر بحث کرنا چاہیں تو "ہماری زبان" کے صفحات اس بحث کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ ـــــ ایڈیٹر

پبلشر: قاضی عبدالغفار صاحب
صدر دفتر انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ
پرنٹرس:
نیشنل پرنٹرس کمپنی، علی گڑھ

انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ

کی سالانہ کانفرنس

یکم مارچ کو اس کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے قاضی عبدالغفار صاحب نے ترقی پسند ادیبوں کو حسب ذیل الفاظ میں مخاطب کیا:

سنہ ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر کی حیثیت سے ایک تقریر کی تھی جس میں انھوں نے تحریک کے اعلان نامہ کے الفاظ دہرائے تھے جس میں ترقی پسند ادیبوں کی اس تحریک کے مقاصد کی وضاحت کی گئی تھی۔ وہ الفاظ یہ ہیں:

"ہم ہندوستان کے تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبے میں رجعت پسندی کے آثار پائیں گے انہیں افشا کریں گے ہم اس انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبہ کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کی تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک، افلاس، اور سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں ہم تمام ان آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں بے چارگی، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں، ہم تمام ان باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔"

اس بنیادی اعلان کے الفاظ کو دہرا کر سجاد ظہیر نے کہا تھا کہ:

"ہم ترقی پسند ادیب سے حقیقت نگاری کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن حقیقت نگاری کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ ہر حقیقت کو بے کم و کاست بیان کر دیا جائے۔ ترقی پسند حقیقت نگاری کے یہ معنی ہیں کہ مختلف اور گوناگوں حقائق سے ان حقائق کا انتخاب ہو جو افراد اور جماعت کے لئے نسبتاً زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور پھر ان حقائق کو اس طرح پیش کرنا کہ ان سے دوچار ہو کر انسان آزادی اور اخلاقی بہتری کی اس شاہراہ پر آگے بڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائیں جو دور حاضر میں انہیں روحانی فضیلت ذہنی بیداری اور جسمانی صحت کی منزل تک پہنچائے۔"

یہ الفاظ جس طرح سنہ ۳۶ء میں صحیح تھے۔ آج بھی ترقی پسند ادب

تحریک کی حقیقی روح کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن بقول سید احتشام حسین "دنیا جس کی تیار شدہ شبیہ کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ تخریب اور تعمیر کے ارتقائی عمل سے ہر لمحہ نئی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے" ۔ اور ہر نئی صورت کے ساتھ ترقی پسند ادب کو آگے بڑھتے رہنا ہے اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا ارتقا رک جائے گا۔ قدیم توہمات کے خلاف جہاد کی منزلیں ہیں جدید توہمات تک پہنچاتی ہیں اور اس طرح زندگی کے ہر قدم پر ہمارے لئے نئے دیوتا اور، نئے بتوں اور نئے معبدوں کا توڑنا ضرور ہو جاتا ہے۔ اس کام کا تسلسل کبھی نہیں رکتا۔ ترقی پسند ادب وہی ہے جو اس تسلسل کے ساتھ اپنی قوت عمل کو بھی تیز تر کرتا رہے۔ کل جو قدریں انقلابی تھیں وہ آج پرانی اور قدیم ہو جاتی ہیں اور پھر نئی جدید تر قدروں کو لیکر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ ترقی پسندی اور زندگی کا یہ (Adjustment) maladjustment کا عمل جاری رہتا ہے لیکن اس maladjustment کے یہ معنی نہیں کہ ایک دور کا ادب پچھلے دور کے ادب کو منسوخ و مسترد کر دیتا ہو۔ فکر انسانی کی بنیادیں قائم رکھکر ہی ہم ان پر اپنے نئے قصر کی دیواریں بلند کر سکتے ہیں۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ زندگی ہر روز ہمارے سامنے نئے مسائل لاتی ہے۔ ترقی پسند ادب کا امتحان یہ ہے کہ وہ کس طرح ان مسائل سے نبٹے۔ روٹی اور سماجی حقوق کا مسئلہ نہ صرف ہمارے ملک کے لئے بلکہ تمام دنیا کی مظلوم آبادی کے لئے ایک بنیادی مسئلہ ہے لیکن کس طرح بیگی کے اس مسئلے پر رجعت پسند ادب کی پر فریب اصطلاحیں پردے ڈال رہی ہیں اس سے بھی ترقی پسند ادب کو ہر وقت خبردار رہنا چاہیے۔

کسی زبان کے الفاظ جس قدر خیالات کے ظاہر کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں اسی قدر خیالات کو چھپانے اور سننے والوں کو دھوکا دینے کا بھی وسیلہ بنتے ہیں۔ رجعت پسند ادب آج بھی الفاظ کی اس فریب کاری سے بہت کام لے رہا ہے۔ مثلاً تین فرنگی اصطلاحیں پیش کرتا ہوں۔ جن کے خلاف ترقی پسند ادب کو جہاد کرنا ہے۔

امن ۔ جمہوریت ۔ اور کلچر

ان اصطلاحوں کی آڑ میں جو فتنے [illegible] دنیا کی امن پسند جمہوریت سے خطرات اور دنیا پر مسلط رہے ہیں۔ جنگ باز چرچل اور ٹرومین کے گروہ "یورپ اور امن" کے نقاب ڈالے ہوئے ہیں۔ آمریت اور مطلق العنانیت نے "جمہوریت" کے پردے میں اپنا منہ چھپایا ہے اور کلچر اور تہذیب کے روپ میں بربریت اور وحشت کے مظاہرے سرگرم عمل ہیں۔ زبردست عوام کی سماجی پستی اور [illegible] کے لئے ان اصطلاحوں کا ایک محاذ تیار ہوا ہے اور [illegible] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اس محاذ پر حق کے مقابلے میں باطل کی [illegible] سامراج سرگرم عمل ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ترقی پسند ادیبوں کو [illegible] اور سامراجی ادب کی ان فتنہ انگیز اصطلاحوں کا اور ان کے تمام متعلقات کا پوری قوت سے مقابلہ کرنا ہے۔ یہ بہت بڑا کام آپ کے سامنے ہے اور اس کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے ملک کی زندگی کا ہر وہ شعبہ آج ہے جو اس وقت مغربی اور سامراجی اقتصادی سیاسی بازیگری سے متاثر ہے۔

ترقی پسند ادب اس حد تک تو کام کر رہا ہے کہ وہ ان فریب کاریوں کے خلاف عوام کے صالح جذبات کو ابھار رہا ہے لیکن جو کچھ شائع ہو رہا ہے اس میں ایسے مسائل پر ٹھوس اور وزنی ادب آسان اور عام فہم زبان میں بہت کم شائع ہوا ہے۔ ہمیں ایسے اہل قلم کی ضرورت ہے جو بین الاقوامی سیاست کی ان فرنگی اصطلاحوں کا ماہرانہ اور سائنٹفک مطالعہ کریں اور ایک ایسا لٹریچر پیش کریں جو پوری قوت سے ان خطرناک حقائق کی پردہ دری کرے حقیقت نگاری کے لئے حقیقت شناسی کی بہت ضرورت ہے۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ خود ہمارے ملک میں سامراجی امن اور جمہوریت اور کلچر کا اشتہار دینے والے رجعت پسند ادب کی اشاعت پر غیر ممالک کا کروڑوں روپیہ صرف ہو رہا ہے اور بہت شرم کی بات یہ ہے کہ بعض ہاتھوں میں وہ روپیہ خود ہمارے ہموطن کرایہ کے لکھنے والوں کی جیب میں جا رہا ہے۔ یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ اس پروپیگنڈے سے ہمارے ناواقف عوام متاثر نہیں ہوتے۔ تو پھر ترقی پسند ادیب ان حملوں کا جواب کس طرح دیں؟ یہ سوال غور کرنے کے قابل ہے۔ کیا ایک آدھ نظم، دو چار غزلوں یا دس بیس افسانوں کو لیکر ہم پروپیگنڈے کے اس سیلاب کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے۔ ہمیں ملکی زبانوں میں جگہ جگہ ایسے محاذ قائم کرنے پڑیں گے جہاں وہ رجعت پسندی جو ترقی پسندی کے روپ میں سامنے لائی جا رہی ہے بے نقاب ہوتی رہے۔

معاف کیجئے اگر جدید ادب کے ایک دوست اور مددگار کی حیثیت سے میں صاف صاف کہوں کہ ہندوستان کے دوسرے مرکزوں کی طرح علی گڑھ میں بھی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کا کام بہت سست رہا ہے۔ ہمیں اس کو زیادہ قوی اور تیز کرنے کی تدبیروں پر غور کرنا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کی اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہوگی اگر وہ یہ سمجھنے لگیں کہ اس کا مقصد اتنا ہی کام ہے کہ دو چار مقالے پڑھ دیں، یا دس پانچ نظمیں لکھ دیں۔ اس طرح زندگی کے تقاضوں کو ایک دفعہ ہی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تقاضے ہر روز بڑھتے رہتے ہیں۔ اور اسی طرح ترقی پسند ادب کی قوت کو بھی ہر روز بڑھتا رہنا چاہیے۔ ورنہ ہم پر شاعر کی اس آواز کو ہمارے کانوں میں گونجنا چاہیے اور ہمارے ذوق عمل کو تازیانہ ہونا چاہیے

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی ۔ نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی (فیض)

صوبہ بہار کی آواز

(از معاصر سنگم، داناپور)

یوپی میں اردو کو علاقائی زبان منوانے کی تحریک کے سلسلے میں چلائی گئی دستخطی مہم کے آغاز کے ڈھائی سال بعد یوپی کا اردو وفد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی و صدر انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی قیادت میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ۱۵ فروری کو ملا اور یوپی کی ایک قابل لحاظ اردو آبادی کی

جانب سے جس کے ثبوت میں تین لاکھ سے زائد دستخط اردو داں کے ساتھ تھے پیش کیا جس میں گیارہ مطالبات درج تھے اور اردو کو یو پی کی علاقائی زبان کی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

. . . .

ہمیں مسرت ہے کہ صدر جمہوریہ ہند نے نہایت تحمل و تجمل کا ثبوت دیکر وفد کی گزارشات کو ٹھکرایا نہیں دیا۔ انھوں نے انکار نہیں کیا۔ صدر محترم نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ اپنی کابینہ سے مشورہ لیکر کچھ کریں گے۔

اس موقعے پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے محترم صدر سے اپیل کریں کہ سیکولر اسٹیٹ، اپنے جمہوریہ کے حاکم اعلیٰ سے یہ گزارش کریں کہ یوپی کے کروڑوں اردو داں کے جذبات کا ضرور خیال کریں جو ملک کے دس کروڑ افراد کی مادری زبان ہے جو جنگ کی زبان ہے اور جو یہیں پروان چڑھی ہے۔ صدر محترم! آپ جب تھائی لینڈ تشریف لائے تھے تو آپ نے اس کا افسوس کیا تھا کہ آج سنسکرت زبان جیسی قیمتی زبانیں قبر میں جا پڑی ہیں حالانکہ ان میں ہمارے خزانے پوشیدہ ہیں۔ آپ جب نالندہ تشریف لے گئے تھے تو آپ نے پالی جیسی عوامی ترقی یافتہ زبان کے مٹ جانے کا غم کیا تھا اور بتایا تھا کہ پالی کا زوال عبارت کی ایک بیش بہا تہذیب کا زوال ہے۔ اس کے قیمتی ورثہ کا نقصان عظیم ہے۔ آپ نے سنسکرت، پالی اور تمام زبانوں میں تحقیق کرنے اور انھیں ترقی دینے کی تلقین و ترغیب کی تھی۔ آپ نے یہ سب اس لئے کیا تھا کہ آپ کو ہندوستان کی ہر ایک زبان سے محبت ہے۔ جن سے بھی چھن گئیں اور آج گڑے مردوں کے برابر ہیں۔ ہمارے محترم صدر کیا ایک زندہ اور ترقی یافتہ، ترقی پذیر، مقبول و ہر دلعزیز، عوامی و جمہوری زبان کے متعلق بھی ہم آپ سے انھیں خیالات عالیہ کی توقع نہ رکھیں؟ تاکہ آج سے ہزار برس بعد کا آنے والا صدر جمہوریہ اردو کے متعلق دکھ بھرے بعض خیالات تشویشناک۔۔۔ اظہار نہ کرے جن کا اظہار آپ نے ان مندرجہ بالا تین زبانوں کے سلسلے میں کیا ہمیں یقین ہے آپ وسعت قلبی سے اس مسئلے کو دیکھیں گے اور حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی حکومت کو مناسب و صالح مشورے دیں گے۔

. . . .

ساتھ ہی ہم بہار کے اردو دوستوں سے بھی کہیں گے کہ اب بہار والوں کو بھی لازم ہے کہ اس موقعے پر زیادہ سے زیادہ دستخط فراہم کر کے اپنا کنونشن کر ہی ڈالیں اور علیٰ العجلہ صدر کے پاس اپنا وفد لے جائیں۔

اردو زبان کا مسئلہ

معاصر "ریاست" کے تاثرات

انجمن ترقی اردو کا ایک ڈیپوٹیشن جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر ہردے ناتھ کنزرو، مسز رادھا نہرو، علامہ پنڈت دتاتریہ کیفی، مولانا حفظ الرحمٰن، پنڈت سندر لال، مسٹر حیات اللہ انصاری، مسٹر کرشن چندر افسانہ نویس، پنڈت کشن پرشاد کول اور قاضی عبدالغفار وغیرہ اصحاب شامل تھے۔ اس ہفتے ہندوستان کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں پیش ہوا۔ اس ڈیپوٹیشن نے اردو زبان کو ہندوستان میں زندہ رکھنے کے لئے ذیل کی تجاویز پیش کیں۔

(۱) جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے وہ ابتدائی درجے میں ذریعۂ تعلیم اردو اور جس مدرسے میں ... کسی کلاس میں دس طلباء اردو بولنے والے بچوں وہاں اردو کے ذریعے تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔ اور جہاں اردو بولنے والی آبادی زیادہ ہو وہاں ایسے اسکول قائم کئے جائیں جن میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔

(۲) ابتدائی درجوں میں اردو کے ذریعے تعلیم دینے کی قابلیت رکھنے والے استادوں کو کافی تعداد میں تربیت دینے کے انتظامات کئے جائیں۔

(۳) اردو میں نصابی کتابیں مہیا کی جائیں۔

(۴) ایسے ثانوی مدارس کو جو اردو کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں ریاست تسلیم کرے اور انھیں سرکاری امداد دی جائے۔

(۵) اتر پردیش میں کم از کم ایک یونیورسٹی ایسی ہو جہاں اردو زبان کو تعلیم کا ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

(۶) اردو کے ذریعے ادب اور سائنس کی خدمت کرنے والے اداروں کو کافی مالی امداد ملے۔

(۷) اردو کے ممتاز اہل قلم اور اہل علم کو حکومت کی طرف سے انعامات دے کر ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

(۸) ہندوستانی اکاڈمی میں اردو کے اہل قلم کو کافی نمائندگی دی جائے۔

(۹) سرکاری کتب خانوں کے لئے اردو کی کتابیں مہیا کی جائیں۔

(۱۰) اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں عدالتوں اور دفتروں میں قبول کی جائیں۔

(۱۱) سرکاری اطلاعات، قوانین اور مطبوعات اردو میں بھی شائع کی جائیں۔

یہ ہے خلاصہ ان مطالبات کا جو ہندوستان میں خصوصاً یو پی وغیرہ صوبہ جات کے علاقوں میں خصوصاً اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لئے صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

ہندوستان میں اردو زبان کی موجودہ پوزیشن یہ ہے۔ ہندوستان کے تین چار کروڑ مسلمانوں کے گھروں میں اردو بولی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے تمام کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں کے گھروں میں اردو رائج ہے۔ یوپی کے تمام صوبے کی زبان ہندوستانی ہے یہ چاہے ہندی حروف میں لکھی جائے یا اردو حروف میں حقیقی زبان کے لحاظ سے اس کو اردو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ دہلی میں اردو کا رواج ہے۔ مشرقی پنجاب کا کوئی شہر، قصبہ یا گاؤں ایسا نہیں جہاں کہ اردو لکھی پڑھی نہ جاتی ہو اور اس صوبے کے قریب قریب تمام اخبارات بھی اردو میں ہیں۔ حیدر آباد کے صوبے کا ہر تعلیم یافتہ اردو بولتا ہے اور بہار، راجپوتانہ، سینٹرل انڈیا اور بمبئی کے صوبہ جات میں اردو بولی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اردو کی اس زبردست پوزیشن اور ہر دلعزیزی

کی موجودگی میں بھی ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کے دشمن نہ ہوں اور یہ اردو دشمنی صرف مذہب کی بنیادوں پر ہے۔ یعنی قریب قریب تمام صوبجات کے ہندو اردو کو صرف اس لئے مٹانا چاہتے ہیں کہ یہ غلطی سے اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھے ہوئے ہیں۔ اور یہ واقعہ تو بے حد دلچسپ ہے کہ بعض اردو اخبارات اردو میں چھپتے ہوئے بھی اردو کی مخالفت میں پیش پیش ہیں اور اس کو مٹانا اپنے مذہب اور اپنی قوم کی خدمت سمجھتے ہیں۔

ہندوستان کی قومی زبان ہندی قرار دے دی گئی ہے اور آئین کے اس فیصلے کے سامنے ہر ہندوستانی کا فرض اور ایمان ہونا چاہئے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اس فیصلے کے سامنے سر جھکا دے۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اگر پنجاب میں پنجابی، بنگال میں بنگالی، گجرات میں گجراتی، مہاراشٹر میں مرہٹی اور مدراس میں مدراسی زبانیں بطور علاقائی زبانوں کے زندہ رہ سکتی ہیں تو اردو کو یوپی، دہلی اور پنجاب میں سے مٹا دیا جائے۔ چنانچہ پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر رفیع احمد قدوائی جیسے انصاف پسند اور مذہبی تعصب سے بلند بزرگوں کے مرکزی وزارت میں ہوتے ہوئے فدایان اردو تو توقع کر سکتے ہیں کہ اس میمورنڈم کے مطالبات پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے گا اور اردو کو ہندوستان میں بطور ایک زبان کے زندہ رہنے دیا جائے گا۔

حیدرآباد کی آواز

(از معاصر سیاست حیدرآباد)

حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب، کلچر اور قدیم روایات اور ماضی کے شاندار ورثہ ہی کا شاندار نتیجہ ہے کہ یہاں تنگ نظری اور فرقہ پرستی کو اپنی جڑیں مستحکم کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ گزشتہ ہفتہ ہندی پرچار سبھا کی کانفرنس میں ہندی، کنڑی، مرہٹی اور تلنگی کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اردو کو بھی اس کا جائز مقام دیا جائے۔ اسی کانفرنس میں چیف منسٹر نے یہ اعتراف کیا تھا کہ حیدرآباد پانچ زبانوں کا سنگم ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے جلسے میں سنئے وزیر تعلیم مسٹر ایکبوٹے نے اردو داں طبقے کو یہ یقین دلایا ہے کہ اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، سابق میں جو کچھ سلوک ہوا ہے اس کو اب فراموش کیا جائے۔ وزیر تعلیمات کے اس بیان سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی پوری طرح یہ محسوس کرتے ہیں کہ سابق میں اردو کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا گیا۔ ان کے ان جملوں سے عوام کو یہی توقع ہے کہ وہ اپنے دور میں اردو کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ کانگریسی وزارت کی تشکیل کے بعد سے وزارت تعلیمات نے اردو کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک اختیار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ لسانی تحریک کے اس دور میں علاقائی زبانوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور ان کی ترقی کی ذمہ داریوں سے بھی بے پروائی نہیں برتی جا سکتی لیکن جہاں اردو کا وجود ضروری ہے ان مقامات سے بھی اردو جماعتوں کی برخاستگی ایک غیر منصفانہ قدم تھی۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ حیدرآباد میں عدالتی اور سرکاری زبان کے لئے اردو کے رواج پر جن شخصیتوں نے اصرار کیا ہے ان کی اکثریت مسلمانوں کی نہیں ہے اور کسی فرقہ وارانہ امتیاز کے بغیر زبان کے مسئلے میں خوشگوار اور متحدہ فضا پائی جاتی ہے۔ نیز حیدرآباد ہی وہ واحد ریاست یا صوبہ ہے جہاں اردو اور ہندی کے تعلقات نہ صرف خوشگوار بلکہ بہت قریبی ہیں۔ یہ کل ہی کی بات ہے کہ پروفیسر ہارون خان شیروانی اور مسٹر حبیب الرحمن معتمد انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے ہندی پرچار سبھا کے مراکز کا معائنہ کیا اور سبھا کی کارگزاری پر صحافتی بیان کے ذریعے اظہار اطمینان کیا جا چکا ہے۔ کی برسر اقتدار جماعت کے وزراء کی اکثریت، مخالف جماعتیں اور سیاسی تنظیمیں بھی اردو کے ساتھ جائز اور منصفانہ سلوک کی حامی ہیں۔ اسمبلی کی روداد بھی بیشتر اسی زبان میں ہوتی ہے۔ حیدرآباد میں اردو ایک نزاعی مسئلہ بنی نہیں رہی اور نہ اب اس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ مگر بعض سرکاری دفاتر میں اردو کی یک لخت موقوفی اور مدارس میں اردو جماعتوں کی برخاستگی سے جو مایوس کن فضا پیدا ہوئی ہے اس کا انسداد ضروری ہے چونکہ اردو پچھلے چند سالوں سے عام رواج کے باعث روزمرہ کے کاروبار اور سرکاری امور میں بول چال کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی ہے۔ وزیر تعلیمات مسٹر ایکبوٹے کی تقریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان مایوسیوں کو یقیناً دور کریں گے جو اردو داں طبقے میں پیدا ہو رہی ہیں۔ مسٹر ایکبوٹے نے خود ہی یہ کہا ہے کہ جامعہ ملیہ کی طرح ادارہ ادبیات اردو کی سرگرمیاں بھی کسی حد تک کمزور پڑ گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہی عام احساس ہے کہ اب اردو کو علاقائی یا سرکاری زبان کا موقف نہیں رہا۔ اگر حکومت دوسری علاقائی زبانوں کی طرح اردو کے ساتھ بھی منصفانہ سلوک کرے تو یقیناً مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اردو بھی ہندی، کنڑی، تلنگی اور مرہٹی کے ساتھ ساتھ ترقی کر سکتی ہے۔ اور اس کا اثر اس ریاست کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی، قدیم روایات کی برقراری اور مشترکہ کلچر کے تحفظ اور ارتقا پر پڑ سکے گا۔ دوسرے صوبوں کی طرح یہاں، زبان سیاسی یا جذباتی مسئلہ نہیں بنے گی اور صوبہ بمبئی اور اتر پردیش کی طرح حکومت و برسر اقتدار جماعت کی تنگ نظری کا شکوہ کرنا ہوگا۔ اس دور میں یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ علاقائی زبانوں، کنڑی، مرہٹی اور تلنگی کے بجائے اردو کو حسب سابق ترجیح دی جائے۔ علاقائی زبان کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ اردو سے منصفانہ سلوک ہماری شکایتوں اور اندیشوں کا سدباب کر سکتا ہے۔

گزشتہ ہفتہ ہندی کانفرنس اور اس ہفتے وزیر تعلیمات کی ادارہ ادبیات اردو میں تقریر ایک فال نیک ہیں۔ اور یہ نوید دیتے ہیں کہ حیدرآباد میں اردو کی زندگی اور بقا کے لئے دوسرے صوبوں کی طرح کسی جنگ یا غیر منصفانہ ذہنیت و سلوک کے اسباب موجود نہیں ہیں۔ اردو بھی علاقائی زبانوں کے پر شور رنگ کے اس دور میں زندہ رہ سکے گی۔ اب یہ اردو داں طبقہ

اور اردو انجمنوں کا بھی فرض ہے کہ نئے دور اور بدلے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں اردو کو فارسی و عربی کے بجائے عام فہم بنائیں۔ اور تمام زبانوں کے ساتھ اپنی ترقی کے لئے بھی ایک راستہ معین کریں۔

انجمن کی خبریں

بھورنا۔ ضلع بلیا

"اردو زبان ہندو و مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے۔"

ملک کے جس نامور ترین ایڈوکیٹ اور سیاسی لیڈر کا یہ قول ہے ان کا نام تیج بہادر سپرو تھا۔ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر تھے اور اردو کے لائق فخر محسن۔ مرحوم جب تک زندہ رہے اردو کے لئے سپر رہے۔ اردو کے ایسے محسن اور فنکار کی یادگار اور سوانح حیات کی اشاعت کی طرف اخبار لیڈر نے اپنے ۲۰ جنوری کے افتتاحیہ میں اشارہ کیا ہے۔ اس کی تائید میں انجمن ترقی اردو بھورنا ضلع بلیا نے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں مرکزی انجمن اور اس کی تمام شاخوں سے اپیل کی ہے کہ وہ فروری کے آخر یا مارچ کے شروع میں "یوم سپرو" منائیں اور الہ آباد میں ان کی یادگار کے لئے عملی جد و جہد شروع کریں۔ الہ آباد کی انجمن ترقی اردو کا یہ قدم لائق تعریف ہے کہ وہ اپنی شاخ کو سر تیج بہادر کی یادگار میں صوبائی بنانے کی خواہش کرتی ہے اور اس سلسلے میں عملی پروگرام بھی بنا چکی ہے جس کا تعلق صوبے میں اردو کے مکاتب۔ شبینہ مدرسے اور تعلیم بالغان سے ہے کام کرنے کا وقت یہی ہے۔ امید ہے کہ ارباب اردو وقت کا ساتھ دیں گے۔

(نامہ نگار)

مغل سرائے ضلع بنارس

منظور نازش صاحب آفس سکریٹری انجمن ترقی اردو مغل سرائے ضلع بنارس لکھتے ہیں کہ:-

انجمن ترقی اردو مغل سرائے کی مجلس عاملہ نے اپنی ایک قرارداد میں الہ آباد کی انجمن ترقی اردو کی تائید کی ہے کہ محسن اردو سر تیج بہادر سپرو کی یادگار میں صوبائی شاخ بنائی جائے۔

دیوبند ضلع سہارنپور

انجمن ترقی اردو دیوبند کے عہدے دار اور مجلس عاملہ کے ارکان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

جناب۔ ماسٹر مہابیر پرشاد صاحب ایم۔ اے صدر
" مولانا فرید الوحیدی صاحب نائب صدر
" اعجاز احمد صاحب قاسمی جنرل سکریٹری
جناب۔ سید فرحت حسین صاحب قاسمی جوائنٹ سکریٹری
جناب۔ ماسٹر منظور احمد " انصاری خازن
جناب۔ مولانا محمد عثمان صاحب چیرمین میونسپل بورڈ۔ رکن مجلس عاملہ
جناب۔ مولانا سید اسعد صاحب "
جناب۔ " سراج الحق "
جناب۔ " شمیم احمد " عثمانی
جناب۔ " محمد جواد " "
جناب۔ " شوکت علی خاں "
جناب۔ " عزیز احمد صاحب بی۔ اے۔
جناب۔ " ماسٹر محمد شعیب خاں صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی
جناب۔ ماسٹر ہر سروپ صاحب
جناب۔ منشی ظریف احمد صاحب

علی گڑھ

قمر چھتاروی صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ:-

ادارۂ علم و ادب (سابق ادبی سوسائٹی) کا مکتب شبینہ جس کا افتتاح ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ہوا تھا اب ۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو خاطر خواہ ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا اپنا سہ ماہی دور پورا کر چکا ہے اس وقت اس شبینہ مکتب میں ۲۷ بچے تعلیم پا رہے ہیں جنھیں قرآن شریف۔ اردو اور دینیات کی تعلیم کے علاوہ اخلاقی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اب تک جناب مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ضلع علی گڑھ۔ جناب مولانا احمد صاحب سورتی لکچرار مسلم یونیورسٹی اور جناب محمود امین محمد خاں صاحب اس مکتب کا معائنہ فرما چکے ہیں۔

ان حضرات نے رجسٹر معائنہ پر اپنے تاثرات کا اظہار بھی تحریر فرمایا ہے۔ ادارہ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ صرف چند مخلص حضرات کی اعانت سے کام چل رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل خیر حضرات اس ادارہ کی زیادہ سے زیادہ امداد فرما کر اپنے بیش از بیش خدمات کا موقع دیں گے

"ادبی سوسائٹی، علی گڑھ" جس کا جدید نام اس کے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے "ادارۂ علم و ادب" رکھا گیا ہے اس کا دوسرا سالانہ انتخاب ۱۷ جنوری ۱۹۵۴ء کو ۷ بجے شب چھتاری کمپاؤنڈ رسل گنج میں ہوا جو حسب ذیل ہے۔

۱۔ جناب محمد قمر صاحب بی۔ اے (علیگ) صدر
۲۔ " عزیز احمد صاحب صدیقی نائب صدر
۳۔ " محمد عزیز خاں قمر چھتاروی مدیر جمہور جنرل سکریٹری
۴۔ " منشی سید محمد علی صاحب خازن
۵۔ " سید علی عباس صاحب تیدی وکیل رکن مجلس عاملہ
۶۔ " اے۔ آر صاحب "

۶۔ جناب وثیق احمد خاں صاحب — رکن مجلس عاملہ
۷۔ " مظہر الاسلام صاحب صدیقی "

مدھوبنی

مدھوبنی کی تاریخ میں یادگار و عدیم المثال اردو کانفرنس سب ڈویژنل انجمن ترقی اردو مدھوبنی کے زیر اہتمام ۲۶ جنوری کی شام کو میونسپلٹی گراؤنڈ میں زیر صدارت سردار لطیف الرحمن صاحب (ایم۔ ایل۔ اے) صدر بہار انجمن ترقی اردو منعقد ہوئی۔

جلسہ گاہ سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شری مہیش پرشاد سنہا وزیر حکومت بہار نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ میں اردو زبان اچھی طرح نہیں جانتا پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ میں جس زبان میں بول رہا ہوں اس کے سارے الفاظ اردو والوں کے لئے اردو ہی ہیں۔

آپ نے حکومت کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے یقین دلایا کہ حکومت اور کانگریسی لیڈروں نے ہندوستان کے ہر باشندے کے تہذیب و تمدن، زبان، کلچر، کی حفاظت کا وعدہ اور دستوری ضمانت دیا ہے لیکن بھائیوں کو اردو کے متعلق حکومت کے رویہ سے شکایت اور اندیشہ ہے۔ حالانکہ دستور ہند میں ۱۴ زبانوں کی فہرست میں اردو کا نام بھی ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اردو اسی ملک میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی یہ کوئی بدیسی زبان باہر سے آئی ہوئی بولی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس زبان کو کوئی مٹا نہیں سکتا کیونکہ یہ زبان ہمارے خون میں رس بس گئی ہے۔ ہمارے گھروں میں بچیاں تک "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گاتی رہتی ہیں۔ تو پھر کوئی اس زبان کی مقبولیت و اہمیت سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔

تقریباً نصف گھنٹہ تک آپ نے سلیس اردو زبان ہی میں تقریر کی جس کے سمجھنے میں کسی کو دقت پیش نہ آئی۔ آپ کی تقریر کے بعد صدر جلسہ کے اشارے پر کچھ نظمیں پڑھی گئیں۔

مولانا مختار احمد [illegible] ندوی، ایم۔ ایل۔ اے، شفیق اللہ [illegible] کی تقریروں کے بعد جناب ابوالاحد محمد نور صاحب ڈپٹی منسٹر نے اپنی بسیط و پر مغز تقریر شروع کی۔ آپ نے ملک خصوصاً ریاست بہار میں اخبار و رسائل کی زبوں حالی، اردو لکھنے پڑھنے والوں کی کس مپرسی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نہایت پر زور الفاظ میں اخبار و رسائل کی ہمت افزائی لکھنے پڑھنے والوں کی اعانت و امداد کی طرف حاضرین کو توجہ دلائی۔

کلام سنا کر حاضرین سے داد تحسین حاصل کرنے والوں میں عبدالغفور احمد تیغ، زبیر مظفر پوری، کاظم باقی پوری، ایم شفیق اللہ شفیق، ماہر رضوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس کانفرنس میں سات تجویزیں باتفاق آرا منظور کی گئیں ایک تجویز میں اردو کو بہار کی علاقائی زبان تسلیم کرنے پر زور دیا گیا۔ دوسری تجویز میں کہا گیا کہ:

"یہ اجلاس اس حقیقت کو بار بار واضح کرتا ہے کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی کا پورا بیڑا و دار و مدار اردو زبان والوں ہی کے سر ہے، اور جب تک اردو داں طبقہ پوری سعی و کوشش سے سرگرم عمل نہ ہوں اس وقت تک محض سرکاری اعانت اور مجبوری پر ہی اردو کو اس کے منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے یہ اجلاس پر زور اپیل کرتا ہے کہ اردو داں طبقہ حسب ذیل پروگرام پر پوری سرگرمی سے عمل کریں۔"

(الف) ہر جگہ اردو مکاتب اور اردو شبینہ مکاتب کا خود اپنی ذمہ داری پر جاری کرنا۔

(ب) ہر ہر جگہ اردو لائبریریوں کا قیام اور اس سے عوام الناس کو مستفید کرانا۔

(ج) اخبار و رسائل کی ہمت افزائی اور اس کے پڑھنے والوں کے حلقے کی توسیع کرنا۔

یہ اجلاس حکومت بہار سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ دستور ہند کے دیئے ہوئے حق کے مطابق اردو داں طبقے کو اس کی آسانی اور اجازت ہو کہ:

(الف) عدالتوں اور دفتروں وغیرہ میں اردو میں درخواست وغیرہ پیش کریں۔

(ب) رجسٹری آفسوں میں اردو میں لکھے ہوئے دستاویز قبالے وغیرہ بے حیلہ و حجت قبول کئے جائیں۔

(ج) شعبہ نشر و اشاعت سے جو مضامین، کتابیں اور رسالے شائع ہوں وہ اردو زبان میں بھی شائع ہوا کریں۔

ایک تجویز میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ مقامی رام کرشن کالج میں اردو کی تعلیم کا ابھی تک کوئی انتظام عمل میں نہیں آیا۔ باوجودیکہ انجمن کی طرف سے بار بار تجاویز کے ذریعے درخواست کی گئی ہے۔

حکومت بہار سے پر زور مطالبہ کیا گیا کہ اردو لائبریریوں کے متعلق جو بالکل غیر تشفی بخش رویہ حکومت نے اختیار کر رکھا ہے اس کو جلد از جلد بدل کر اردو لائبریریوں کو کافی امداد پہنچانے کے احکام جاری کرے۔

آخر میں تمام اردو داں حضرات سے پر زور اپیل کی گئی کہ وہ ہندی زبان کو سیکھنے اور اس میں عبور حاصل کرنے کی پوری سعی و کوشش کریں۔

الہ آباد

انجمن ترقی اردو الہ آباد کی ایک میٹنگ ۲۳ جنوری ۱۹۵۵ء کو چار بجے سہ پہر میں پروفیسر مسیح الزماں کے مکان پر منعقد ہوئی۔ پہلے غلام علی انصاری صاحب بی۔ اے نے اپنا ایک مختصر افسانہ "تجربے کے دیوتا" پڑھا افسانہ ختم ہونے کے بعد لوگوں کو اس پر اظہار خیال کرنے کی دعوت دی گئی سب سے پہلے سراج احمد صاحب نے غلام علی صاحب کے طرز تحریر کی داد دی اور افسانے کی کردار نگاری اور اس کے موضوع کو کامیاب ٹھہرایا۔ اس کے بعد پروفیسر مسیح الزماں صاحب نے افسانے کے مجموعی تاثر کو کامیاب کہنے کے

ساتھ ساتھ یہ مشورہ دیا کہ اس میں اولین بت تراش کا ذکر کیا گیا ہے وہ اصل کہانی سے بے جوڑ معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کو نکال دینا چاہیئے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس افسانے میں بڑی اچھی طرح ایک مندر کے پجاریوں کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ آخر میں ہیروئن کو مندر کے بلند زینوں سے گرا کر مارا نہ جائے تو ایک طرف افسانے کی فنی خوبی بڑھ جاتی ہے اور دوسری طرف انجام کی انتہا پسندی باقی نہیں رہتی۔

پروفیسر عقیل نے بھی انجام کو اتنا تیز المیہ بنانے کی مخالفت کی لیکن ان کے نزدیک افسانے کے ابتدائی حصے میں اولین بت تراش کا تصور پیش کیا تھا

عابد امرار صاحب نے کبھی غلام علی صاحب کے اس فقرے پر اعتراض کیا "بستی کے مردہ جسم میں کہیں کہیں پر جان باقی تھی۔"

اس کے بعد عابد امرار صاحب نے اپنا افسانہ "اور میں ہار گیا" پڑھا پروفیسر خلیل حسین صاحب نے اس کو پسند کرتے کہا کہ اس افسانے میں کوئی پلاٹ نہیں ہے بلکہ اس میں روزمرہ زندگی کا ایک معمولی واقعہ بیان کر دیا گیا ہے۔ ایسے واقعات سیکڑوں ہوتے ہیں۔ افسانے میں ان کو پیش کرنے کے لئے کسی باقاعدہ پلاٹ کا ہونا ضروری ہے۔

پروفیسر مسیح الزماں نے افسانے کی داد دیتے ہوئے اس کو موجودہ زمانے میں پولیس والوں کی زیادتی کی بڑی اچھی تصویر ٹھہرایا۔ ان کی رائے میں اس افسانے میں تمہید غیر ضروری تھی جس میں سنہ ۴۷ء کے فسادات کا ذکر کیا گیا ہے اسی میں افسانے کے بجائے مضمون نگاری اور خطابت کی جھلک آگئی ہے۔

آخر میں انھوں نے تلفظ اور زبان و بیان کی چند خامیوں کی طرف بھی عابد امرار صاحب کو متوجہ کیا۔ غلام علی صاحب نے افسانے کی داد دیتے ہوئے بعض الفاظ کو بدل دینے کی تجویز پیش کی۔

بھورو | انجمن ترقی اردو بانس پار بھورو ضلع بلیا کے سکریٹری رحمت اللہ صاحب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

انجمن نے اپنے چوتھے سالانہ اجلاس کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ یہ اجلاس ہر سال عید کے پہلے ہفتے میں ہوتا ہے۔

اس سال مجلس مقالات میں کئی مشہور ادیبوں کی شرکت یقینی ہے اور طرحی مشاعرہ کے علاوہ ایک عام اجلاس بھی ہوگا جس میں مشاہیر علمائے کرام کی تقریریں ہوں گی۔

علی گڑھ | انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کا سالانہ جلسہ مسلم یونیورسٹی یونین ہال میں یکم مارچ سنہ ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا۔ پہلی نشست ۱۰ بجے دن سے شروع ہوئی جس کی صدارت قاضی عبدالغفار صاحب نے کی۔ فیض کی ایک نظم "گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں" سے جلسہ شروع ہوا۔ جسے اشتیاق محمد خاں نے پڑھ کر سنایا پھر سکریٹری نے انجمن کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد مقالات اور نظموں کا دور شروع ہوا۔

ڈاکٹر مسعود حسین نے "فیض کی شاعری" پر اپنا مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے فیض کے دونوں مجموعے "نقش فریادی" اور "دست صبا" کو سامنے رکھ کر ان کے ذہنی ارتقا اور شاعرانہ مزاج کا تجزیہ کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ فیض نے ہمارے قدیم ادب کی روایت سے جہاں فائدہ اٹھایا ہے زبان مغربیہ کے جدید فن اور تجربوں سے بھی اکتساب کیا ہے۔ اس لئے ان کا لب و لہجہ مانوس ہوتے ہوئے بھی تر و تازہ اور نیا ہے۔ دوسرا مقالہ اسلوب احمد انصاری نے "سائنٹفک نظریۂ تنقید" پر پڑھا۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے یہاں تنقید میں عام طور پر ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ پرانے انداز کے لوگ زبان و بیان اور طرز نگارش پر زور دیتے ہیں اور جن نئے لوگوں کا شعور زیادہ پختہ نہیں ہے وہ چند سیاسی موضوعات کو پیمانہ بنا کر ادب کو جانچتے ہیں۔ سائنٹفک نظریۂ تنقید ان دونوں طریقوں کا مخالف ہے وہ ادب کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے۔ یعنی اس کے موضوع، ہیئت، جمالیاتی پہلو اور روح عصر ان تمام چیزوں کو دیکھ کر ادب پر حکم لگایا جاتا ہے۔

دوسری نشست ۲½ بجے سے ۴½ بجے تک ہوئی جس کی صدارت پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کی۔

انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادب کے بنیادی مقاصد سے تو شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ البتہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں معقول لوگوں کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی تعداد نالائق اور غیر معقول لوگوں کی بھی گھس آئی ہے جس کی وجہ سے ادب میں افراتفری اور بے راہ روی پیدا ہو گئی ہے اور ان کی بے راہ روی کی وجہ سے خود ادب کو اور ترقی پسندی کو نقصان پہنچا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پڑھے لکھے اور سنجیدہ ترقی پسند ادیبوں کی ایک اکیڈمی بنائی جائے جس کی مدد سے ہم اس ادبی سیلاب کی روک تھام کر سکیں اور صرف انھیں عناصر کو پنپنے دیں جو ادب کے لئے جاندار اور مفید ہیں۔ علی گڑھ کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ جد و جہد کرے۔ کیونکہ تمام ادبی تحریکوں کی نشو و نما میں اس ادارہ کا ایک اہم رول رہا ہے۔ اور اب بھی یہاں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔

اس کے بعد کرشن چندر نے اپنی ایک تازہ ترین کہانی پڑھی جو رونان برگ اور امن سے متعلق تھی۔ پھر "ترقی پسند ادب" پر ڈاکٹر عبدالعلیم نے ایک جامع تقریر کی۔ جس میں انھوں نے ترقی پسند ادب سے متعلق تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادب بندھے ٹکے فارمولے سے نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ ہر وہ ادیب جو انسان دوست ہے وہ ترقی پسند ادب پیدا کر سکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ترقی پسند ادب کی اصطلاح ضرور نئی ہے لیکن ترقی پسندی ہر زمانے کے ادب میں موجود رہی ہے یہاں تک کہ وہ ادیب بھی ترقی پسند ادب تخلیق کرتے رہے ہیں جو نظریاتی طور پر ترقی پسندی کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے مثال کے طور پر انھوں نے

تکسی داس اور شانتی کا نام لیا۔ انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ اپنی تخلیقات میں چاہے جتنی بھی اچھی بات کہیں لیکن وہ اس وقت تک ادب نہیں کہی جا سکتی جب تک وہ ادب کے مطالبات کو نہ پورا کریں۔ وہ اچھی بات تو ہو سکتی ہے لیکن ادب نہیں۔

ان دونوں نشستوں میں دو تجاویز پاس کی گئیں۔ ایک تجویز رشید جہاں کی موت پر اظہار تعزیت کی اور دوسری تجویز فیض اور سجاد ظہیر کے بارے میں۔

مقالات اور تقریر کے دوران میں شعر و شاعری کا دور بھی جاری رہا جس میں غلام ربانی تاباں۔ ڈاکٹر مسعود حسین، ڈاکٹر نجیب الرحمن خلیل الرحمن اعظمی۔ باقر مہدی۔ جاوید کمال۔ انجم پندیر۔ شمر فتح پوری اور اور فرحت کا کوروی نے حصہ لیا۔ (نامہ نگار)

بلند شہر

اختر برنی صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو ضلع بلند شہر عنقریب اپنے ضلع کے مشہور مقامات کا دورہ شروع کریں گے اور انجمن کی شاخ بنائیں گے۔ نیز شبینہ مدرسہ اور تعلیم بالغان کا بھی انتظام کریں گے۔

انھوں نے اپنے ضلع کے اردو دوستوں سے اپیل کی ہے کہ ان کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اردو کے بہی خواہ ان سے پورا پورا تعاون کریں۔ (نامہ نگار)

علی گڑھ

انجمن ترقی اردو طلبائے مسلم یونی ورسٹی کے عہدے دار اور اراکین۔

محمد لطف الرحمن صدیقی فیروز	صدر
سیتہ یعسوبتی، انیس شیروانی	نائبین صدر
حامد اللہ غازی	جنرل سکریٹری
ایوب خاں، فضل حق قریشی	سکریٹری
مرزا علی خاں	خازن

اراکین :- رضی الدین صدیقی۔ رضی احمد۔ گرو در۔ سلطان علی شیدا۔ سید آصف علی۔ عبد القیوم۔ احمد رشید شیروانی۔ صدیق الرحمان قدوائی۔ ظفر مسات جیلانی۔ سلطان محی الدین۔ عابد رضا بیدار۔ افتدار عالم۔ محمد احسن۔ شمشاد حسین۔

اب انجمن کا دفتر مرکز سے ہو چکا ہے۔ اور اراکین نے سرگرمی کے ساتھ کام شروع کر دیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ امتحانات کے ختم ہونے کے بعد کام کی رفتار اور تیز ہو جائے گی۔

(نامہ نگار)

نان پارہ

محمد رافت علی خاں صاحب آفس انچارج انجمن ترقی اردو نان پارہ اطلاع دیتے ہیں کہ:-

انجمن ترقی اردو شاخ نان پارہ کا ایک ادبی اجتماع ۱۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو بوقت ۸ بجے شب جناب مرزا ابرار احمد صاحب جنرل سکریٹری انجمن ہذا کے دولت کدے پر منعقد ہوا۔ اس اجتماع کی صدارت محترم مولانا خیر بہوروی مددگار جنرل سکریٹری مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کرنے والے تھے لیکن موصوف بعض مجبوریوں کے باعث تشریف نہ لا سکے۔ اس لئے صدارت کے فرائض شاعر انقلاب مولانا انور صابری صاحب نے انجام دیئے۔

شرکا میں اسکول اسٹاف، تحصیل اسٹاف، اور شہر کے معزز اور تعلیم یافتہ حضرات کے علاوہ ہر مکتب خیال اور ہر مذہب و ملت کے افراد شامل تھے۔

سب سے پہلے جنرل سکریٹری صاحب نے اجتماع کی ضرورت، انجمن کی کارگزاریوں اور دستخطی مہم کے منظر اور پس منظر پر مختصر روشنی ڈالی۔ بعدہٗ صدر جلسہ نے اردو ادب کے حال و مستقبل پر ایک مدلل تقریر کی۔

"آپ نے صدر جمہوریہ سے وفد انجمن ترقی اردو کے شرف باریابی اور ان کی امید افزا گفتگو پر تبصرہ کرتے ہوئے پرستاران اردو کو بتلایا کہ زبان صرف حکومت کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ عوام کے بل بوتے پر پروان چڑھتی ہے اور ترقی کرتی ہے۔ اردو زبان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ کبھی بھی سرکاری زبان نہیں رہی۔ اس کے باوجود اس نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے اور آج اس قابل ہے کہ دنیا کے ہر لٹریچر سے آنکھ ملا سکتی ہے۔ اس لئے آپ حضرات سے میری گزارش ہے کہ آپ اردو کے مستقبل سے مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی کوششیں برابر جاری رکھیں اور یو، پی حکومت کی اردو بیزاری سے متاثر نہ ہوں۔"

رہروے راہ محبت تھک نہ جانا راہ میں
لذت صحرا نوردی دوری منزل میں ہے

صدارتی تقریر کے بعد مشاعرے کا دور شروع ہوا۔ مقامی شعرا میں محمد احمد صاحب شفا، احسان الحق صاحب ثنا۔ واصف القادری صاحب اور حافظ غوث محمد صاحب غوث کا کلام اور مسٹر محمد طاہر صاحب۔ وی۔ اے۔ پی۔ ٹی کی ایک نظم اردو جس کی ردیف اردو تھی کافی مقبول ہوئی۔

آخر میں صدر جلسہ نے اپنی کئی غزلوں اور نظموں سے محفل کو گرما لیا اور سامعین نے بھی داد و تحسین کے پھول برسائے۔

"صدر جلسہ نے اردو شاعری پر اور اردو کے استعارہ و تشبیہات پر غیر ملکی ہونے کے الزامات کا اپنے اشعار سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو وسعت اور گہرائی اور سادگی اور دل نشینی اردو ادب میں پائی جاتی ہے وہ ہندوستان کے کسی زبان کے لٹریچر کو بھی میسر نہیں"